حضرت قاری قمر الدین صاحب رحمتہ اللہ علیہ

اللہ تعالیٰ اپنے دین کی خدمت جس سے چاہتا ہے لے لیتا ہے۔ یورشِ تاتار کے افسانے سے یہ بات پوری طرح عیاں ہے کہ جب کعبے کے وارث اپنی میراث کی ناقدری کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے صنم خانے سے اس کے پاسباں پیدا کر دیئے۔ دور کیوں جائیے، ماضی قریب میں جب سید کے بیٹے نے "ہیر" لکھی، تو ایک سکھ کے بیٹے نے قرآن کی تفسیر لکھی۔ وارث شاہ نے ہیر لکھی اور مولانا احمد علی لاہوری نے قرآن کی تفسیر لکھی۔

راجپال نامی آریہ سماجی ہندو نے ایک کتاب لکھی جسمیں نبی اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کی گئی تھی۔ جب غازی علم الدین شہید جو پیشے کے لحاظ سے بڑھئی تھے نے اس بدبخت کو جہنم واصل کیا تو علامہ اقبال مرحوم نے کہا۔

"اسیں گلاں کردے رہے تے ترکھاناں دامُنڈا بازی لے گیا"

(ہم تو باتیں ہی کرتے رہے اور بڑھئی کا بیٹا بازی لے گیا) ۱۹۵۳ء کی تحریک تحفظ ختم نبوت میں ہزاروں مسلمانوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ تب مشائخ عظام اور پیرانِ کرام تو تسبیح کے دانوں پر وظیفے گردانتے رہے اور وہ نوجوان جن کا تعلق کوچہ رنداں سے تھا۔ اپنے سینے گولیوں سے چھلنی کراتے رہے۔

ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

اسکی وجہ شاید یہی ہے کہ اللہ ان لوگوں کو قربانی کی توفیق دیتا ہے جو شکستہ دل ہوتے ہیں، اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھنے والے..... علم تو انسان میں تواضع پیدا کرتا ہے لیکن اس کے برعکس اگر علم تکبر پیدا کر دے۔ اور بندے اور اللہ کے درمیان حجاب کی سب سے بڑی وجہ بن جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی آمد سے پہلے یہود، اوس و خزرج کو بڑے فخر سے جتلایا کرتے تھے کہ ہم میں ایک نبی آنے والا ہے۔ لیکن نبی کریم محمد ﷺ کی بعثت کے بعد اوس و خزرج تو آمنا و صدقنا کہ کر رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ کا اعزاز لے گئے اور یہود اپنے نفس کے قیدی بن کر جہنم کے حقدار ٹھہرے۔

عروس البلاد لاہور کی درسگاہوں کو کھنگال ڈالئے۔ یہاں قرآن پڑھنے اور پڑھانے والوں کی اکثریت معاشی طور پر بدحال علاقے اور پس ماندہ طبقے سے تعلق رکھنے والوں کی ملے گی۔ صرف لاہور ہی نہیں پورے کرۂ ارض پر تعلیم و تعلم قرآن میں لگے اشخاص کی اکثریت کا تعلق اسی طبقے سے ہوگا۔ چند سال پہلے ایک ایسے ہی پس ماندہ علاقے سے تعلق رکھنے والے خادم قرآن اس دنیا سے انتقال کر گئے۔ ان کا اسم گرامی تھا.....

قاری قمر الدین

قاری صاحب ایک سیدھے سادے انسان تھے۔ جنہیں بڑا بننا آتا ہی نہیں تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو زمین پر یوں سر جھکا کے چلتے ہیں جیسے اللہ کی اس زمین میں اللہ کی نشانیوں کو تلاش کر رہے ہوں۔ جینے کا یہ ڈھنگ اور سلیقہ انہوں نے شجاع آباد کے ایک باخدا بزرگ حضرت مولانا عبداللہ بہلوی رحمہ اللہ سے سیکھا تھا کہ.....

پردۂ ہستیؔ موہوم ہٹالو پہلے
پھر جہاں چاہو یار سے باتیں کر لو

چنانچہ انہوں نے وصالِ یار کے شوق میں اپنی ہستی کو اندیشۂ جاں سمجھا۔ ان کو اپنی گردن جھکا کر اپنے عیوب پر نگاہ ڈالنے کا فن آگیا تھا۔ اسکے بعد پھر ان کی نگاہ میں کوئی برا نہ رہا۔

قاری صاحب کا تعلق پنڈی گھیب کے پسماندہ علاقے سے تھا۔ علم کی پیاس انہیں ایک دُور افتادہ گاؤں سے اٹھا کر لاہور لے آئی۔

خیرکم من تعلم القرآن و علمہ

(تم میں سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے) والی حدیث پر انہیں ایسا یقین آیا کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی قرآن سیکھنے اور سکھانے میں گذارنے کا فیصلہ کر لیا۔

آدمی دو ہی اچھے ہوتے ہیں۔ جنہیں عشق سے کام ہوتا ہے۔ یا پھر وہ جو کام سے عشق رکھتے ہیں۔ قاری صاحب کا تعلق دوسری CATAGORY سے تھا۔ چنانچہ اس عشق کے لئے انہوں نے کسی بھی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کیا۔ "بڑے میاں کے درس" سے کام کا آغاز کیا۔ گدی نشین میانوں کو "جی حضوری" (YESMAN) قسم کا مولوی چاہیئے تھا۔ ان کی عجز میں ڈوبی ہوئی طبیعت کو دیکھ کر انہیں دھوکا ہوا اور انہوں نے قاری صاحب کے مقام کو نہ سمجھا۔ لیکن وہ یہ بھول گئے کہ..... "پھولوں کی حفاظت کے لئے خار ہیں یہ لوگ"! قاری صاحب نے اصولوں پہ سودا نہ کیا۔ اور ڈٹ گئے۔ ان گدی نشینوں نے حسبِ روایت قاری صاحب پر حملہ کرا دیا۔ "مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا" لیکن بہر حال مقابلہ گدی والوں سے تھا۔ بن گدی کے آدمی کہاں تک ٹک سکتا ہے! مدرسہ چھوڑنا پڑا۔ مبارک مسجد میں جہاں کسی زمانے میں مولانا مودودی درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ وہاں کام شروع کر دیا۔ یہاں بھی کچھ لوگ مخالف ہو گئے اور یہ جگہ بھی چھوڑنی پڑی۔ اور ہجرتوں کے عذاب سہتے سہتے نسبت روڈ سے ملحقہ ایک مسجد میں پڑھانا شروع کر دیا۔ یہاں کی انتظامیہ کمیٹی کے ایک صاحب سمگلنگ کا شوق فرماتے تھے۔ چاہتے تھے کہ رند کے رند رہیں اور ہاتھ سے جنت بھی نہ جائے۔ سمگلنگ کے سامان کے لئے مسجد کا کمرہ استعمال کرنا چاہتے تھے۔ قاری صاحب آڑے آگئے۔ یہ صاحب بھی خاص ترنگ میں تھے۔ جھگڑا ہوا تو معاملہ عدالت تک پہنچا اور یہ صاحب جیل میں پہنچے۔ قاری صاحب بھی جھگڑتے جھگڑتے تنگ آگئے تھے۔ چنانچہ کوپر روڈ پر ایک کمرہ کرائے پر لیا۔ اور وہیں تدریس کا

کام شروع کر دیا۔ اس اثناء میں بھونڈ پورہ مزنگ میں ایک خستہ حال عمیر آباد مسجد پر نظر پڑی۔ قاری صاحب نے یہاں ڈیرے ڈال دیئے۔ اس مسجد سے پھر قاری صاحب کا جنازہ ہی اٹھا۔ حالانکہ قاری سراج الدین صاحب نے دارالعلوم الاسلامیہ میں آنے کی دعوت دی۔ ۷۰۰ روپے تنخواہ کی پیشکش بھی کی۔ جو کہ اس زمانے میں خطیر رقم تھی۔ لیکن قاری صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو اپنی دنیا آپ پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ انکار کر دیا۔

وہ دن لد گئے جب لوگوں کی نگاہ میں معیارِ شرافت نیکی اور تقویٰ ہوا کرتے تھے۔ جب "وفاداری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے" کا سبق دیا جاتا تھا۔ جب بیٹیاں اس نصیحت کے ساتھ گھر سے رخصت ہوتی تھیں کہ..... سرخ جوڑا پہن کر جا رہی ہو، اب اُس گھر سے سفید جوڑا پہن کر ہی نکلنا۔ اب یہ چیزیں قصۂ پارینہ بن کر کتابوں کی زینت بن چکی ہیں۔ آکا دکا لوگ ہیں جو اس نئے زمانے میں ان پرانی باتوں کے امین ہیں۔ قاری صاحب بھی انہی لوگوں میں سے تھے۔ قاری صاحب نے جوانی میں اس مسجد میں قدم رکھا۔ پھر موت ہی ان کو یہاں سے جدا کر سکی۔ بظاہر دیکھنے میں یہ ایک معمولی اور چھوٹی بات نظر آتی ہے۔ لیکن کبھی آپ مسجد کے امام بنے ہوں، یا کسی مدرسہ میں آپ نے پڑھایا ہو تو شاید اس مشکل کو آپ محسوس کر سکیں! جن روحانی تکالیف کا سامنا ان لوگوں کو کرنا پڑتا ہے۔ سیکولر "کوڈوؤں" کو کیا معلوم کہ یہ لوگ بھی اپنے سینے میں دھڑکتا ہوا دل رکھتے ہیں۔ اسمیں وہ تمام آرزوئیں اور تمنائیں مچلتی ہیں۔ جو عام لوگوں کے دلوں میں ہوتی ہیں۔ لیکن یہ لوگ اللہ کی رضا کے لئے اپنی ذات کو تج کر خدمتِ قرآن میں لگے رہتے ہیں۔ بلاشبہ یہی لوگ افضل ہیں۔ قاری صاحب کو بھی ان روحانی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن انہوں نے پورے صبر و استقامت کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا۔ وفات سے ایک دن پہلے شام کو میں عیادت کے لئے گیا تو چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔ لیکن وفات کے بعد ان کے چہرے کو دیکھا تو یوں لگا۔ جیسے بڑی ہی گہری نیند سو رہے ہوں۔

موت آئی عشق میں تو ہمیں نیند آگئی
نکلی بدن سے جان تو کانٹا نکل گیا

ان کے چہرے کا سکون اور لبوں پر کھلی مسکراہٹ اس بات کی چغلی کھا رہی تھی کہ انہیں یہ مژدۂ جانفزا سنا دیا گیا ہے۔

یا یتھاالنفس المطمئنۃ ارجعی الیٰ ربک راضیۃ مرضیۃ۔ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔

اے روحِ مطمئن! اپنے پروردگار کی طرف چل۔ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ ہمارے خاص بندوں میں شامل ہوجا۔ اور ہماری بہشت میں داخل ہوجا۔

دوسروں کے لئے جینا بھی ایک فن ہے۔ کہ اپنے لئے تو سب جیتے ہیں۔ قاری صاحب خود کو مصائب و آلام

کی دھوپ میں جھلساتے رہے۔ لیکن دوسروں پر سایا کرنا نہ چھوڑا۔ اپنے خلوص سے انہوں نے لوگوں کے دلوں کو مسخر کر لیا تھا۔

منافقت کو وہ سخت ناپسند کرتے تھے

خوشامد سے انہیں نفرت تھی

خوشامدی اور غلط بات کرنے والے کو منہ پر ٹوک دیتے تھے۔

یہ جو کھلی کھلی تھیں عداوتیں مجھے راس تھیں
یہ جو زہر خند سلام تھے مجھے کھا گئے

ابتدا میں بڑے مجلسی آدمی تھے۔ دوست احباب کے ساتھ خوب گپ شپ رہتی لیکن جب حضرت بہلوی رحمہ اللہ سے تعلق قائم ہوا تو یہ نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئے۔

دولت کی ہوس نے آج کے انسان کو منافق بنا دیا ہے۔ لوگ ایک ہی چہرے پر کئی چہرے سجائے پھرتے ہیں۔ دلوں میں فاصلے رکھ کر ملنے کا چلن عام ہے۔ ہر شخص "بغل میں چھری اور منہ میں رام رام" کے فلسفے پر عمل پیرا ہے۔ قاری صاحب نے ایک انسان کے لئے دوسرے انسان کو پہچاننا آسان بنا دیا تھا۔ ایک چہرے سے دوسرے چہرے کو نکالنے کا فن ان کے ہاتھ آگیا تھا۔ وہ ہر شخص سے ایک ہی چہرے سے ملتے اور اسی بات نے انہیں لوگوں میں اعتماد بخشا۔

قاری صاحب کی طبیعت کا ایک بنیادی وصف عجز تھا۔ فلوبیر نے کہا ہے کہ، ساری خرابی ذہنی رعونت کی وجہ سے ہے۔ صاحبِ فن میں ناز اور غرور پیدا ہونا قدرتی بات ہے۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو کسی فن میں کمال حاصل ہونے کے بعد بھی اپنی اصل پر قائم رہتے ہیں۔ اور سادگی کو طبیعت کا حصہ بنائے رکھتے ہیں۔ قاری صاحب نے اپنی ذات سے انا کا کانٹا نکال دیا تھا اور پھول ہی پھول ہو گئے تھے۔ یہ بہت بڑی سعادت ہے کہ قاری صاحب حضرت بہلوی سے ملنے کے لئے جاتے تو وہ تمام مصروفیتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اُن سے ملنے کے لئے دوڑے چلے آتے۔ حتّٰی کہ بیماری میں بھی جب کسی اور کو ملنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ ان پر خصوصی شفقت فرماتے ہوئے ضرور ملتے۔ "حقیقت یہ ہے کہ شیخ کی شیفتگی، مرید کی اعلیٰ تربیت کا نشان ہوتی ہے"

یہ محبت تو نصیبوں سے ملا کرتی ہے
چل کے خود آئے مسیحا کسی بیمار کے پاس

قاری صاحب ایک بیباک اور فقیر منش انسان تھے۔ انہوں نے کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا۔ صرف اللہ کے سامنے سر جھکایا۔ وہ نصف صدی تک قرآن پڑھاتے رہے۔ لیکن اپنا گھر تک نہ بنایا۔ جبکہ آجکل کے خدام قرآن اللہ کے "فضل و کرم" اور قرآن کی "برکت" سے بنے سجائے گھروں میں بستے اور خوشنما گاڑیوں میں

سفر کرتے ہیں۔

جو خودی کو مہین رکھتے ہیں
کوٹھیاں تین تین رکھتے ہیں

قاری صاحب جمالی بھی تھے۔ اور جلالی بھی۔ عام لوگوں کے لئے سراپا جمال لیکن شاگردوں کی تربیت میں وہ خاصے سخت گیر تھے۔ یہاں جلال ہی جلال تھا جمال کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ طالب علموں کو اپنے جلال کی بھٹی میں گرم کرتے اور پھر کندن بنا کر نکالتے۔ یہ ان کی تربیت کا ہی اثر ہے کہ ان کے شاگردوں کی اکثریت قرآن کی خدمت میں مصروف ہے۔

قاری صاحب یوں بھی خوش قسمت تھے کہ اُن کے دادا اور پردادا حافظ بھی تھے اور عالم بھی۔ ان کے واحد فرزند استاذیم قاری محمد عارف علوی صاحب نہ صرف حافظ و قاری ہیں بلکہ عالم دین بھی۔ سینکڑوں قراء کرام ان سے تجوید و قرأت کا علم حاصل کر چکے ہیں۔

قاری صاحب کا واحد پوتا بھی حافظ و قاری ہے۔ ان کے نواسے اور بھانجے اور بھتیجے بھی حافظ و قاری ہیں اور سبھی قاری صاحب کے شاگرد! اس پہ جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ یا یوں کہیئے فخر کرنے کی چیز اگر ہے تو صرف یہی۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے فرزند شاہ عبدالقادر نے چالیس سال کی محنت شاقہ کے بعد جب قرآن مجید کا پہلا اردو ترجمہ مکمل کیا تو خوشی سے ان کے اوراق کو بار بار پلٹتے تھے اور یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

روزِ محشر ہر کسے در دستِ گیرد نامہ
من نیز حاضر می شوم اوراقِ قرآں دربغل

(قیامت کے دن جب ہر شخص اپنا نامہ عمل لیکر حاضر ہوگا تو میں بھی قرآن کے اوراق لے کر حاضر ہوں گا)

قاری صاحب نے بھی اپنی پوری زندگی اس میدان میں لگا دی۔ سینکڑوں شاگردوں کو قرآن حفظ کرایا۔ ان شاگردوں کی اکثریت اپنے استاد کی طرح قرآن سکھانے میں مصروف ہے۔ اور یوں چراغ سے چراغ جلتے رہیں گے۔ جب تک دنیا باقی ہے۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا۔ اور کسے معلوم کہ قیامت تک ان کی یہ روحانی اولاد ہزاروں لاکھوں تک جا پہنچے۔ اور پھر جب ہر شخص اپنا نامہ عمل لیکر حاضر ہوگا تو قاری صاحب بھی اپنے جلو میں اپنے شاگردوں کو لئے حاضر ہوں گے۔ اور ان شاء اللہ جنت کے اونچے درجوں کے حقدار ٹھہریں گے۔

ان کے جنازے پہ لوگوں کے اژدھام کو دیکھ کر حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ کے داماد حافظ شفقت صاحب کو بڑی حیرت ہو رہی تھی۔ کہ وہ شخص جو اتنا خلوت پسند تھا۔ جس کے جنازے کی خبر نہ تو ٹی وی میں نشر ہوئی اور نہ کسی اخبار میں شائع ہوئی، پھر یہ اژدھام کیسا؟ میرے ذہن میں یکایک حضرت اکبر کا یہ شعر آگیا

ہنگامے انھیں کے لئے ہیں صلِ علیٰ کے
جو زیست میں عاشق تھے ھواللہ احد پر

یہ کالج کے کسی پروفیسر یا دنیاوی لیڈر کا جنازہ تھوڑا ہی تھا۔ مجھے یاد ہے کہ گورنمنٹ کالج لاہور کے ہمارے ایک پروفیسر صاحب کے والد انتقال کر گئے۔ ہم سب ٹیوشن پڑھ رہے تھے کہ جنازے کے وقت چھٹی دے دی گئی۔ اس ٹیوشن سنٹر میں قریباً بیس تیس تو ایسے طلبہ بھی ہوں گے جو ان پروفیسر صاحب کے شاگرد تھے۔ میں نے اپنے پانچ چھے دوستوں کو نماز جنازہ میں شرکت کے لیے کہا، جو چند قدم دور ہونا تھی۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی تیار نہ ہوا۔ بہت کم لڑکے نمازِ جنازہ میں شریک ہوئے۔ نمازِ جنازہ کے عمل میں صرف پانچ منٹ لگے ہوں گے۔ لیکن یار لوگ پانچ منٹ دینے کے لئے بھی تیار نہ ہوئے۔ اصل میں جب سے اساتذہ نے تعلیم و تعلّم کو صنعت کا درجہ دے دیا ہے۔ اور پڑھائی کا بل وصول کرنا شروع کر دیا ہے۔ تب سے طلباء نے بھی ہدیۂ دل دینا چھوڑ دیا ہے۔ یہ قلبی محبت و اُنس اور حقیقی احترام تو دینی تربیت کے نتیجہ میں حاصل ہوتے ہیں۔ الحمدللہ دینی مدارس میں نوبت یہاں تک نہیں پہنچی۔ بقول حضرتِ اکبر

دنیا کو خوب دیکھا جتنی محبتیں ہیں
موقع کی سازشیں ہیں مطلب کی ساعتیں ہیں
البتہ جو تعلق دینی خیال سے ہے
اسمیں وفا ہے شامل اور دل کو راحتیں ہے

قاری صاحب نے قرآن کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ سو کامیابی ان کا مقدر ٹھہری۔ دنیا میں بھی

ورفعنالک ذکرک

کے زمزمے میں اور اخروی کامیابیاں، تو ہیں ہی!

ہم سب پر واجب ہے کہ ان لوگوں کے لئے جنہوں نے اس دور ظلمات میں دین کی شمعیں روشن کیں، ہر نماز کے بعد مغفرت اور ترقیٔ درجات کی دعا کریں۔ آپ بھی ہاتھ اٹھا کر قاری صاحب کے لئے دعا کر دیجئے

اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ۔ آمین!

....

قادیانیوں کے یہودیوں سے روابط اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں!
ایک تحقیقی کتاب جس کے کسی حوالہ کو کوئی مرزائی آج تک رد نہیں کرسکا۔
ابو مدثرہ
قادیان سے اسرائیل تک
قیمت =/60روپے
بخاری اکیڈمی مہربان کالونی ملتان۔